

تعمین خطاب

مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن میں تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ مثلاً 'إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ' (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے۔ علماء اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ تعلیم فرمائی ہے، گویا یوں فرمایا کہ اس طرح کہو، لیکن یہاں 'کہو' کا لفظ موجود نہیں ہے تو اس مقدر کو کیسے جانا جائے؟

اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارہ میں بھی پیدا ہوتا ہے، یعنی خطاب کن سے ہے؟ ہر خطاب میں دو پہلو ہوتے ہیں: ایک یہ کہ مخاطب کرنے والا کون ہے؟ دوسرا یہ کہ مخاطب کون ہے؟ اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ کبھی یہ عام ہوتے ہیں اور مراد ان سے خاص ہوتی ہے، اور کبھی اس کے بالکل برعکس۔ اور چونکہ جہت خطاب کی تبدیلی اور اس کے عام یا خاص ہونے کی وجہ سے معانی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں، لہذا ضروری ہے کہ اس کے لیے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کر سکیں، کیونکہ اس معاملہ میں بعض مرتبہ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو آدمی کو شائبہ شرک کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ مولانا روم ایک جگہ یہ تک کہہ گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نبی کا بندہ بنا دیا ہے، کیونکہ آس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو 'يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا' (اے میرے بندو جنہوں نے زیادتی کی) کے الفاظ سے خطاب کریں۔ مولانا روم کے متعلق میرا یہ

* الفاتحہ: ۱-۴۔

** الزمر: ۳۹-۵۳۔

گمان نہیں ہے کہ انھوں نے فی الحقیقت نبی کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے، لیکن بات ان کی زبان سے ایسی نکل گئی ہے جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو معاف فرمائے۔ اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے۔ 'يُعِبَادِي الَّذِينَ اسْرَفُوا الْآيَةَ' کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے۔ اس کے شروع میں 'جَوْفُلُ' ہے، وہ پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچادیں۔ کسی عام کلام کی توجیہ اس کی خاص جہت خطاب کے اعتبار سے ایک مستقل باب ہے۔ تعین خطاب کا علم اسی باب کا ایک شعبہ ہے۔ جس شخص پر کلام کا صحیح رخ واضح نہیں ہوگا، وہ اس کی صحیح تاویل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ پس یہ باب تاویل اور نظم کلام کے فہم کی کلید ہے اور اس سے بے خبری بہت سی غلطیوں اور ٹھوکروں کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک مستقل مقدمہ میں ہم علم توجیہ کے عام قواعد بیان کریں گے۔ اصول بیان کرنے سے پہلے یہ مقدمہ ہم نے محض اس لیے لکھ دیا ہے کہ فی الجملہ اس مسئلہ سے لوگوں کو انس ہو جائے۔ مسئلہ خطاب ان بہت سی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے جن میں ہمارے مفسرین مبتلا ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم اس پر علیحدہ بحث کریں۔

خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اس کو لفظ مشترک کی طرح سمجھنا چاہیے اور اس میں بعض پہلوؤں کا اختیار کرنا اور بعض کو چھوڑنا ناگزیر ہوگا۔ جس طرح ایک لفظ مشترک کے تمام معانی کو ہم معلوم کرتے ہیں اور پھر سیاق کلام کی روشنی میں کسی معنی کو اختیار کرتے ہیں اور کسی کو چھوڑتے ہیں، وہی طرز عمل ہمارا اس وقت ہوگا جب کوئی خطاب مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو۔ لہذا اولین شے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم خطاب کے مختلف پہلو معلوم کریں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتهی۔

مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا جبریل یا رسول یا لوگ۔

اسی طرح منتهی یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا رسول یا لوگ۔

لوگوں میں مسلمان ہوں گے یا منافقین یا اہل کتاب یا ذریت اسماعیل یا ان میں سے دو یا تین یا سب۔

اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ یا دونوں۔

یہ پہلو تو بالکل ظاہر ہیں۔ اب ان کے اختلاط والتباس کی صورتوں پر غور کرنا چاہیے۔

۱۔ اس مسئلہ کی پوری توضیح مولانا نے اپنی کتابوں 'اصول التاویل' اور 'کتاب الاسالیب' میں فرمائی ہے۔ یہاں یہ بحث ناتمام رہ گئی ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں ابھی شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ (مترجم)

مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ، رسول اور جبریل کے مابین ہوتا ہے۔ اگر تم بغیر تنبیہ کے قرآن پڑھتے چلے جاؤ تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ قائل کون ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی تو بعینہم مرسل کا قول نقل کر دیتے ہیں، اور کبھی وہ بات بطور خود ادا کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر جاری فرمائی ہے۔ پھر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض مبلغ کلام الہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپ کے معلم کی حیثیت سے، یہ ان کے معلم ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہے: 'عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى، ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ'۔

پھر یہ تمام حیثیات ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی بغیر کسی تنبیہ کے نمایاں ہوتی ہیں اور سیاق کلام کے سوا کوئی اور چیز اس باب میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی۔

اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ انبیاء کے کلام کی یہ ایک مشترک خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ زبور میں بھی اس کی مثال موجود ہے، دیکھو باب ۴۶ آیات ۷-۱۱: 'لشکروا کا خداوند ہمارے ساتھ ہے..... خاموش ہو جاؤ اور جان لو کہ میں خدا ہوں..... لشکروا کا خداوند ہمارے ساتھ ہے۔'

قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ جب کلام صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا تو اس میں جلال و ہیبت اور قوت و سطوت کا اظہار ہوگا۔ لہذا اس طرح کا کلام ضرورت کے مواقع پر نمودار ہوتا ہے۔ ہم یہاں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مدعا سمجھنے میں تم کو آسانی ہو۔

مثلاً سورہ اقرأ شروع سے حضرت جبریل کی زبان سے ہے، لیکن جب غصہ کے اظہار کا موقع آیا ہے تو کلام صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے ہو گیا ہے: 'كَأَلَّا لَعْنُ لَمْ يَنْتَه لَنْسَفَعًا بِالنَّاصِيَةِ*... (یہ کچھ نہیں، اگر باز نہ آیا تو ہم چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے)۔

منتہی میں التباس پیغمبر اور مومنین کے درمیان ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ مخاطب بظاہر تو پیغمبر ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کا کان ہوتا ہے، اس لیے مخاطب اسی کو کیا جاتا ہے۔ تورات میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ مخاطب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بصیغہ واحد کیا گیا ہے، لیکن اس سے مراد ان کی امت ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے مواقع میں نظم و سیاق کی رہنمائی سے

* النجم ۵۳: ۵-۶۔ 'اس کو ایک مضبوط توتوں والے، عقل و کردار کے توانا نے تعلیم دی ہے۔'

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کون ہے؟ سورہ توبہ میں ایک آیت ہے:

إِنْ تُصِيبَكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِيبَكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ. (۵۰:۹)
 ”اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: خوب ہوا، ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا۔“

یہاں خطاب واحد کا ہے، لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں۔ چنانچہ اس کے جواب سے اس کی وضاحت ہو گئی

ہے:

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ. (۵۱:۹)
 ”کہہ دو، نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی مصیبت، مگر جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان۔“

اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہے، لیکن خطاب امت کی طرف ہے۔ مثلاً:
 إِمَّا يَنْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَمْرًا وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. (۲۳:۱۷)
 ”اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں جھڑکنا اور ان سے ادب کی بات کہنا۔“

اسی طرح کی متعدد مثالیں عام خطاب کی ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے:

أَلَمْ تَعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ. (۱۰۷:۲)
 ”کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہے۔“

اسی قاعدہ پر ہم آیت ذیل کو بھی محمول کرتے ہیں..... (بیاض)۔

(مجموعہ تفاسیر فراہمی ۶۰-۶۳)

۲ یہاں بھی مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مسودہ میں خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور ایک نہایت اہم بحث نام تمام رہ گئی ہے۔ (مترجم)

ماہنامہ اشراق ۲۰ اگست ۲۰۱۳ء